مولانا عبدالمعید سلفی، علی گڑھ

مولانا جھنڈانگری: چند تاثرات

مولانا عبدالرؤوف رحمانی اس دنیا سے رخصت ہوگئے، کون یہاں آیا ہے عمر دوام لے کر، اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

اس حیات مستعار میں انسان کی تگ ودو رنگارنگ ہوتی ہے قل اعملوا فسیری اللہ أعمالکم، ایک طرف عمل ہے اور دوسری طرف ثمراتِ عمل، عمل اور ثمرات عمل کی اہمیت مسلم ہے، خوش نصیب ہے وہ انسان جو کامیابی سے ہم کنار ہوجائے۔

مولانا رحمانی نے ایک بھرپور اور طویل زندگی گزاری ۹۸ سال کی عمر میں بھی ان کے مطالعہ و تحریری کام میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا، اس عمر میں بھی ان کی کاوشیں جوانوں کے لئے قابل رشک تھیں۔

اپنی طویل عمر میں انسان کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے یہی حاصل حیات ہے یہ راز ہے جسے عالم الغیب کے سوا کون جانے؟ لیکن اصل میں یہی تخلیق انسانی کا ماحصل ہے ہر انسان کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں نہ کوئی بے خیرا ہے نہ کوئی بے عیب ہے اگر انسان پکڑ سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہے دنیاوی کروفر اور نقشے بازیاں کچھ کام آنے والی نہیں۔

مولانا رحمانی کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں جو ان کے ساتھ گئیں جب انسان حیات ہوتا ہے تو عام طور پر اس کی خوبیاں نگاہوں میں زیادہ جچتی نہیں ہیں اور اس خودپرستی اور مصلحت پژوہی کے دور میں بلا سبب ناراضگیوں کا لاوا پھوٹتا ہے پھر کہاں کس کو خیال کہ کسی کی خوبیوں پر نگاہ ڈالے۔

مولانا رحمانی ایک بھولی طبیعت کے انسان تھے اس بھول پن نے انہیں بہتوں کی نگاہ میں زندگی میں بے وقعت بنائے رکھا، شاید یہ بات عجیب لگے لیکن میری ریڈنگ یہی ہے اس بھولے پن کے سبب انہوں نے بہت سے نقصانات بھی اٹھائے مسائل کے فہم میں معاملات کی تہ تک پہونچنے میں، انسان کے سمجھنے میں انہیں چوک ہوجاتی یا دیری لگتی، ان کی

یہ طبیعت ان کے علمی انہماک کی دین ہے، ان کا انہماک علمی کاموں میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ زندگی کی دوسری ساری ضرورتیں ثانوی حیثیت اختیار کر چکی تھیں، ساری ضرورتوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، ان کے قریب رہنے والوں کو اس انہماک کی مکمل خبر ہے، ان کے ہم عصروں میں اتنا انہماک کسی کے اندر مشکل سے رہا ہو گا، اس انہماک میں ان کا مدرسہ، ان کی خطابت اور ان کے تحریری کام سبھی شامل ہیں، یہی تین چیزیں ان کی زندگی کی پہچان ہیں، ان کی پہچان نہ ان کی زمین داری ہے نہ کوئی اور شے انہیں تین کا نام مولانا عبدالرؤف رحمانی ہے۔

نظامت، خطابت اور تحریری کاموں کو انہوں نے اپنے خون جگر سے لالہ زار کیا ہے اللہ نے انہیں جتنی جسمانی وذہنی صلاحیت دی تھی ان تین کاموں کی انجام دہی میں پوری صلاحیت صرف کر دی، سستی اور کمی کا سوال ہی نہیں رہا، اس دور میں شاذ ونادر ایسے لوگ ہیں جو اپنی تمام تر صلاحیت لگا دیتے ہیں، پوری توانائی اور صلاحیت کے استعمال کرنے میں ان کے پاس شرائط بھی نہیں تھے جب اور جس وقت چاہا یا ضرورت پڑی یا بلاوجہ ہی محسوس کیا پوری دلچسپی، توانائی کے ساتھ جٹ گئے۔

ان تینوں کام کی انجام دہی میں بسا اوقات انھوں نے اپنی شخصیت اور حیثیت کی پروانہ کی حالانکہ ہر انسان کی اپنی ذات ایک پرائیویٹ مسئلہ ہوتا ہے اس کے تحفظ کا اسے پورا حق ہے اور اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے، لیکن وہ اس حق سے بھی دست بردار ہو جاتے تھے، ان کا انہماک والہانہ پن کے درجے پر پہونچا ہوا تھا، وہ ہمیشہ مقصدیت سے سرشار رہتے تھے۔

مدرسہ دیار پورب نیپال سرحد میں چند گنے چنے مدرسوں میں تھا، جس جذبہ دین سے اسے قائم کیا گیا اس کا حق تھا کہ وہ پروان چڑھے، بانی نے اس کے لئے اپنے ایک بیٹے کو شروع ہی سے تیار کیا اور ہر ممکن کوشس کی کہ اس کی ترقی جاری رہے، مولانا رحمانی ہی پدر ارجمند کے پسر سعادت مند تھے۔

مدرسہ کا نظام سنبھالنے کے بعد لگتا ہے مدرسہ ہی مولانا کا گھر مولانا کی آل اولاد بن گیا اور اصلی گھر اور آل اولاد کی حیثیت ثانوی ہو گئی اس کی خاطر انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا، کم ہوں گے جنھوں نے کسی مدرسے کے لئے ایسی قربانی دی ہو گی، مدرسے کے لئے ان کی قربانی کی ایک تاریخ ہے جو پچاس سال سے زیادہ وقفے پر پھیلی ہے اگر ان کی اس قربانی کی

داستان بیان کی جائے تو رونے والے روئیں گے بھی اور ماتم کرنے والے ماتم بھی کریں گے، قدرت کی کیا مشیت ہے اسے دہی جانے بظاہر اسباب عروج وزوال کون وفساد اور ساخت و ریخت یہی بتاتے ہیں کہ اگر مشیت الہی مدرسے کے لئے مولانا رحمانی کو نہ مہیا کرتی تو مدرسے کی ایک ایک اینٹ بک گئی ہوتی اور کسی کو اس کا نشان بھی نہ ملتا۔

مدرسہ کن کن مراحل سے گذرا اور کس تگ ودو سے مولانا نے اسے بچایا آج ان حقائق کا ادراک ہی مشکل ہے اور مشکل تو اس وقت بھی تھا جب علاقے کے "انقلابی" لوگوں نے چار سال تک مدرسہ ان سے چھین رکھا تھا اور اسے تالا لگ جانے کے دہانے پر پہونچا دیا تھا، خیر سے بدھو گھر کو آئے ان کی انقلابیت کو پھپوند لگ گئی اور جلد ہی وہ اپنی اوقات کو جان گئے کہ مدرسہ چلانا اور انقلاب لانا دو الگ چیزیں ہیں، انقلاب ماضی سے برگشتہ اور ثابت کو تباہ کر دیتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے مگر مدرسہ چلانا خون جگر جلانے، رخ لالہ سنوارنے، اذیتیں اٹھانے، مشکلات جھیلنے اور نئی پود کو سنوارنے بنانے اور نکھارنے کا نام ہے، یہ جگر کاوی سب کے بس کی بات نہیں۔

مولانا نے اسے اپنی ذاتی محنت سے سرسبز وشاداب رکھا بہت سے اسے نوچنے اور کھسوٹنے میں لگے رہے اور مولانا اسے اس وقت بھی ترقی کی راہ پر لگائے ہوئے تھے اور وہ بھی دیہات میں جب آج کی طرح صدقات وعطیات کے نام پر بہت کم آمد کی امید رہتی تھی، اگر اس مدرسے کو دور اندیشی، صلاحیت اور اہل کاروں کی بہترین ٹیم میسر ہوتی تو بہتر سے بہتر اور شاہکار عظیم ادارہ بن جاتا، لیکن صورت حال یہ رہی کہ مظلوم رحمانی کو مدرسہ کے ساتھ اپنی ذات کو بھی بچانے میں لگنا پڑتا تھا، جان بخشی کی انہیں نہ معلوم کتنی قیمت چکانی پڑی ہوگی۔

مدرسے کے ساتھ انہوں نے دیگر مکاتب اور مدرسہ نسواں کو بھی پروان چڑھایا، یہ سب ان کی کوششوں کے ثمرات ہیں۔

مدرسے کی خاطر نیپال کی پہاڑیوں میں بھٹکے، تونگروں کی تونگری کی دہائی دی، علماء کے حوالے دیئے، اہل جاہ کے جاہ ومرتبت سے استفادہ کیا، وطن ودیار غیر میں اپیلیں کیں وہاں گئے جہاں ان کا جانا مناسب نہ تھا، خوردوں تک کو بھی اس کے لئے یاد کیا خطوط لکھے سفارشیں لکھوائیں۔

سبھی ادارے والے یہ کرتے ہیں لیکن ان کے اندر انہماک اور بچاؤ کی تدبیر اور

ترقی کی راہ تلاش کرنے میں جو والہانہ پن تھا وہ دوسری جگہ کہاں اور پھر خود کے لئے نہیں اور چند سال نہیں عمر بھر، خطابت ایک ایسا فن ہے جس سے خطیب انسان کی بھیڑ کو اپنے کنٹرول میں کرلیتا ہے اس فن کے بہت سے میدان ہیں، دینی خطابت مولانا کا میدان تھا۔

کم از کم اہل حدیث حلقے میں ہندوستان میں آزادی کے بعد سے اب تک ایسا خطیب نہیں ابھرا بہت سے آئے چند دن اپنے کمال کا جوہر دکھایا لیکن پھر خاموشی، مولانا رحمانی چوتھے دہے سے لے کر آٹھویں دہے تک اپنے خطابت کا جادو جگاتے رہے جس قسم کی خطابت انہوں نے کی اس کے لئے بڑے ریاض اور محنت کی ضرورت ہے وہ ریاض سب کے بس کی بات نہیں ہے چالیس سال تک ایک خطیب کی پورے ہندوستان میں گونج سنائی دیتی رہی تین تین گھنٹے ہزاروں اور لاکھ سے اوپر کے مجمع کو خطیبانہ آہنگ سے مسحور رکھنا کمال کی بات ہے، انسان تو بسا اوقات دوسروں کی چند تقریر سے بھاگ لینا چاہتا ہے لیکن نصف شب میں کڑی سردی یا سخت گرمی میں بھی کسی خطیب کی خطابت سے سحر زدہ ہو جانا کس چیز کی دلیل ہے قدرت نے اسے کتنا کمال عطا کیا ہوگا جسے کروڑوں انسانوں نے سحر زدہ ہو کر سنا۔

مولانا کی خطابت کی وہ کیا خوبی تھی کہ جس سے سامعین سحر زدہ تھے اور چند سال نہیں پورے چالیس سال تک انہیں مسحور ہو کر سنتے رہے اور اور ایک بار نہیں بار بار۔

ایسا لگتا تھا جیسے سامعین مولانا کے مہمان ہیں دور سے آئے ہوئے ہیں بھوک سے پریشان ہیں نصف شب کے بعد ان کے لئے لذیذ خوش ذائقہ انواع واقسام کے کھانوں کا مولانا دستر خوان سجائیں گے اور لوگ کھانے کے لئے تشریف لائیں گے۔

جب تاریکی بڑھتی تھی اور رات اپنے عروج پر آتی تھی اس وقت مولانا کا آہنگ خطابت عروج پر ہوتا اور لوگوں کی سحر زدگی بھی عروج پر ہوتی، ایسا لگتا جیسے لوگوں کی نگاہیں مولانا کے چہرے سے باندھ دی گئی ہیں اور ہزاروں نگاہیں صرف اس خطیب کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں جسے قدرت نے حسن صورت کی جگہ حسن صوت اور حسن خطابت سے نوازا تھا، لوگوں پر سکوت کی چادر تنی ہوتی، محویت ایسی کہ خود کا لوگوں کو ہوش نہیں ہوتا۔

اور یہ خطابت ایسی بھی نہیں کہ چند واقعات کا تکرار یا اس میں کسی طرح کا پھکڑپن، بلکہ اس کے اندر علمی رعب وجلال بھی آخر بات کیا تھی وہ کون سا کمال تھا کہ مولانا کی خطابت جادو بن کر سر پر چڑھ کے بولتی تھی۔

ان کی خطابت کے کئی عناصر تھے جن کے متوفر ہونے سے انہیں کامیابی ملتی تھی، جس موضوع پر ان کی تقریر ہوتی تھی اس موضوع کو وہ تیار ہی نہیں کرتے تھے اسے وہ سجاتے تھے نفس موضوع کو عربی، اردو اور فارسی اشعار سے مزین و مرصع کرتے تھے، چٹکلے لطیفے قصہ کہانی تاریخی واقعات سے اسے دلچسپ بناتے تھے حوالوں سے انہیں باوزن بناتے استطرادات ایسے ہوتے جو سامعین کے اسکل کے مطابق ہوتے۔

مرکزی مفہوم کو قرآنی آیات اور احادیث سے مدلل کرتے پھر موضوع کو تمام ضروری تیاریوں کے بعد پیش کرنا ہوتا، مرکزی مضمون کو کہاں چھوڑنا ہے کب اس سے متعلق واقعہ سنانا ہے؟ کب چٹکلہ بیان کرنا ہے کہاں عربی یا اردو یا فارسی کا شعر پڑھنا ہے اور آیت یا احادیث کے ساتھ انہیں کیسے جوڑنا ہے، آواز کب کتنی بلند ہونی چاہئے زیر و بم کی مقدار کتنی ہونی چاہئے کب لحن کا استعمال اور کب سادہ بیان، ساتھ ہی حوالوں کا ذکر اسٹیج پر علماء سے کب لقمہ لینا ہے اور ان سے تائیدی بات کہلوانی ہے، غرضیکہ علم و فن کا ایک سیل کبھی سبک سیر کبھی تند بلاخیز، کبھی وادی میں جاری کبھی پہاڑی نالہ بنا ہوا۔

کتنوں نے مولانا کی خطابت سے خطابت سیکھی ان کے واقعات کو اپنی زنبیل میں ڈال کر گلی گلی صدا دیتے پھرے نقالی کرنے والوں نے نقالی کی کوشش کی، لیکن کوئی جھنڈا نگری نہ بن سکا جو ریاض جھنڈا نگری نے کیا سب کے بس کی بات نہیں خطیب الہند و خطیب الاسلام بننے کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ آسانی سے نہیں مل جاتی ہیں۔

اب تک اس خطیب کی جگہ خالی ہے خطیب کی آواز بھی خاموش ہوگئی اللہ کرے کوئی خطیب الاسلام پیدا ہو جائے اور دین حق کے لئے سرمایۂ صد شکر بن جائے، کون جانے غیب میں کیا ہے ہو سکتا ہے نعم البدل مل جائے۔

ان کا علمی انہماک بھی قابل رشک ہے انھوں نے خطابت کا فیض بانٹنے کے لئے پورے ہندوستان میں سیکڑوں شہروں قصبوں اور دیہاتوں کا سفر کیا ہوگا لیکن ان اسفار نے ان کے علمی انہماک کو کم نہیں کیا، جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا نے اپنے پیچھے کئی درجن کتابیں چھوڑی ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں ان کی دو کتابوں ایام خلافت راشدہ اور ایمان و عمل پر مجھے بھی تبصرہ کرنے کا موقع ملا، ایام خلافت راشدہ پر عربی وار دو دونوں زبانوں میں تبصرہ لکھا گیا تھا اردو میں تبصرہ کافی لمبا تھا اسے جماعت کے کسی پرچے میں چھپوایا بھی گیا تھا، ایمان

دعمل پر جولائی یا اگست کے پہلے ہفتے میں جھنڈا نگر ہی میں دار الضیافہ سراج العلوم میں بیٹھ کر لکھا گیا، مولانا کا خط آیا تھا کہ میں دوبارہ تبصرہ لکھ دوں کیوں کہ وہ تبصرہ جو لکھا گیا تھا غائب ہو گیا ،افسوس تبصرہ تو درکنار خط کا جواب بھی نہ دے سکا تھا اور یہ خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عربی میں شاید دوسروں کے لئے پہلا اور آخری کام میں نے مولانا ہی کا کیا تھا جامعہ سلفیہ کے دور طالب علمی میں، عالمیت رابع میں ان کی مطبوع کتابوں کا عربی میں تعارف لکھا تھا جو شاید ۲۵ صفحات پر مشتمل تھا اور اس تعارف لکھنے کے بدلے انعام ملا تھا جس سے احباب نے بھی حصہ لیا اور مٹھائی کھائی گئی۔

اللہ نے مولانا کو جتنی ذہنی جسمانی قوت اور علمی صلاحیت دی تھی اس کے استعمال میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا، ان کی علمی کاوشیں بھی باعث رشک ہیں جو کچھ قدرت الٰہی نے ان پر فیض کیا تھا اسے انہوں نے لوگوں تک پہونچایا، لوگوں نے انہیں پڑھا، جانا اور استفادہ کیا۔

مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں کی اچھائیوں کے قدر دان تھے اگر کسی کی کوئی تحریر پسند آگئی تو فوراً خوشی کا اظہار کرتے وہ خوردوں کی بھی قدر کرتے اور ان کو اہمیت دیتے، ان کے کئی خطوط مجھے بھی ملے اگر کوئی مضمون پسند آگیا تو فوراً پسندیدگی کا اظہار کیا اور تشجیعی خط لکھا۔

انھیں خوردوں سے استفادہ کرنے میں عار نہ تھا وہ بلا جھجھک ان سے کسی علمی نقطے پر تبادلۂ خیال کر لیتے اور ضرورت ہوتی تو حل مطالب و مشکلات میں مدد لیتے۔

ان کے مضامین کثرت سے بے شمار پرچوں میں چھپتے تھے کم ہی لوگ ہوں گے جو برابر مسلسل ان کی طرح لکھتے اور چھپتے رہے ہوں۔

ان کا حلقہ عقیدت و تعارف بہت وسیع تھا عقیدت مندوں کا شمار کیا وہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتے تھے اور تعلقات نبھانے کی کوشش کرتے تھے برصغیر اور عرب میں بے شمار علماء ان کے قدر دان تھے۔

وہ دو بہ تک وہ رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی ممبر بھی رہے جب تک اس قابل تھے کہ چل پھر سکیں برابر اس کی میٹنگوں میں شریک ہوتے رہے لیکن جب چلنے سے معذور ہو گئے تو رابطہ کی سالانہ میٹنگوں میں ان کی شرکت بند ہو گئی۔

جماعت اہل حدیث ہند کو انھوں نے بہت کچھ دیا آزادی کے بعد سے ہی وہ جمعیت اہل حدیث کو اپنا تعاون دیتے رہے نوگڑھ کانفرنس کے انعقاد، جامعہ سلفیہ کے قیام میں انھوں نے جماعت کی دیگر مقتدر ہستیوں کے ساتھ قائدانہ رول ادا کیا۔

نیپال میں جمعیت اہل حدیث کے قیام کی بہت بعد میں کوشش ہوئی بہر حال اس میں اسے ان کی سرپرستی حاصل رہی۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند اور ضلعی جمعیت بستی کے وہ بہت دن تک ذمہ داروں میں رہے، نوگڑھ کے اجلاس کے لئے انھوں نے اور مولانا عبد الجلیل رحمانی رحمہ اللہ نے بڑی جانفشانی کی، گرمی کے زمانے میں بھی پیدل چلنا پڑا تب بھی وہ جد و جہد سے باز نہ آئے، اللہ ان دونوں کو غریق رحمت کرے۔

ان کی تعلیم بنارس "مدرسہ رحمانیہ" میں ہوئی تھی اس کی دلچسپ کہانی خود مولانا نے بارہا بیان کی، لیکن مولانا رحمانی رحمانی اس وقت بنے جب رحمانیہ دار الحدیث دہلی میں تعلیم حاصل کی اور سربرآوردہ علماء اور بہترین تربیتی و علمی ماحول میں سانس لی، رحمانیہ بھی کیا عجب تعلیم گاہ تھا کہ جس کا اس ادارے سے انتساب ہو گیا وہ بس رحمانی ہی بن گیا، قدرت کا فیضان ہے ارادوں نیتوں اور کوششوں پر اس کی کرم فرمائی کا جلوہ بھی عجب ہوتا ہے۔

مولانا رحمانی کے پدر بزرگوار نے جس اصرار، تمنا اور خواہش سے انہیں تعلیم دلوائی وہ اسی وقت قانع ہوئے جب وہ ان کے معیار پر پورے اترے اور ان کی نگاہ میں کارآمد بن گئے۔

مولانا کے شاگردوں کا بھی حلقہ رہا انھوں نے مدرسہ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد کچھ دونوں تک پڑھایا بھی ہے اس سے ان کے شاگردوں کا بھی ایک حلقہ رہا ہو گا کون گنائے ان کے شاگردوں کو جب سالہا سال تین تین گھنٹہ تقریر کرتے رہے تو کیا حد و شمار ہو سکتا ہے ان کے شاگردوں کا۔

مدرسے کے لئے ان کا انہماک اور والہانہ پن اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس والہانہ پن کے سبب دوسرے واجبات حیات سے جن کا سماجی و عائلی زندگی سے تعلق ہے غفلت کے شکار بھی ہو جاتے تھے نیز مدرسے کے بچاؤ کی خاطر ان کا شکار بھی کیا جاتا تھا اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور مدرسہ جو انہیں ان کی اولاد سے زیادہ پیارا تھا اس کا بہترین خلف عطا کرے اور ان کے پس ماندگان کو، باہم شیر و شکر رہ کر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔